بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

ہر دور کے کچھ مخصوص نعرے ہوتے ہیں جن کا چلن آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ ہر شخص کی زبان پر رواں ہو جاتے ہیں اور ہر کس و ناکس بلا ادنیٰ غور و فکر انہی کے انداز میں سوچنے اور انہی کی زبان میں بولنے لگتا ہے۔ ان نعروں کا رواج عام عقل و فہم کی موت کے مترادف ہے۔ جب یہ ذہنوں پر چھا جاتے ہیں تو آزادیٔ فکر باقی نہیں رہتی۔ عامی اور عالم، اَن پڑھ اور پڑھے لکھے، سب انہی کا سہارا لینے لگتے ہیں اور سمجھ بوجھ کی صلاحیتیں اِس آکاس بیل کے تحت مرجھا جاتی ہیں۔

ہمارے دور میں بھی کچھ خاص نعرے ہیں جو رواجِ عام اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں نعرہ ہے "بازمانہ بساز"۔ آئے دن یہ بات بڑے زور و شور سے دُہرائی جا رہی ہے کہ:

> "زمانہ بدل چکا ہے۔ مذہب کو زمانے کی تبدیلیوں کا ساتھ دیتے ہوئے نئے حالات کے مطابق بدلنا چاہیے۔ اگر مذہب دورِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا گیا تو اس کے خلاف بغاوت ہوگی اور وہ زندگی سے بیدخل ہو جائے گا۔ جمود کا نتیجہ موت ہے۔ ہم کو زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدلنا ہوگا۔ ورنہ موت کے لیے تیار ہو جانا چاہیے"

آج جسے دیکھو وہ کسی نہ کسی عنوان سے یہی درس دیتا نظر آتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس نعرے پر "ایمان بالغیب" لانے کے بجائے اس کے تمام پہلوؤں پر عقل و بصیرت کی روشنی میں غور کیا جائے اور محض اس لیے کسی بات کو قبول کرنے کی غلطی نہ کی جائے کہ اس کا

اظہار تکرار ہو رہا ہے۔

اس امر میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ زمانہ ہمیشہ بدلتا رہا ہے، بہت کچھ بدل چکا ہے۔ مزید رنگ بدلے گا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جمود ایک مصیبت ہے جو قوم کی تخلیقی قوتوں کو تاریخ بستہ کر دیتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر تبدیلی صحت مند ہے؟ کیا ہر تغیر باعثِ خیر ہے؟ کیا تاریخ کا ہر قدم عروج ہی کی طرف اٹھتا ہے؟ اور کیا ہر حرکت بلندی ہی کی سمت جاتی ہے؟

ان سوالات پر جب آپ تاریخ کی روشنی میں غور کریں گے تو لازماً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان کا جواب نفی میں ہے۔ ہر حرکت ترقی کے مترادف نہیں۔ ایک نوع کی حرکت اگر آپ کو ثریا کی بلندیوں تک لے جا سکتی ہے تو ایک دوسری قسم کی حرکت تحت الثریٰ کی پستیوں تک لے اترتی ہے۔ مطلوب نفس حرکت نہیں بلکہ صحیح سمت میں حرکت ہے۔

ترقی ایک اضافی اصطلاح ہے۔ ترقی اور تنزل کا فیصلہ منزل کے لحاظ ہی سے ہو سکتا ہے۔ ہم صرف اسی حرکت کو ترقی کہہ سکتے ہیں جو صحیح راستہ سے ہمیں اپنی منزل کی طرف لے جا رہی ہو۔ جو حرکت منزل کے برعکس سمت میں لے جائے وہ ترقی نہیں بلکہ تنزل ہے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حرکت سے پہلے سمتِ حرکت اور منزلِ مقصود کا تعین ہونا چاہیے ورنہ محض جمود کو توڑنے کے شوق میں کوئی حرکت کر کے آپ اپنی منزل سے اور دُور بھی ہٹ سکتے ہیں۔ تمدنی اور تہذیبی زندگی میں اصل معیار وہ مقصد ہوتا ہے جو آپ حاصل کرنا چاہیں۔ اگر آپ کا مقصد اور آپ کی منزل اسلام ہے تو پھر ہر وہ حرکت جو اس کی مخالف سمت میں لے جائے، خواہ وہ کتنی ہی سبک خرام کیوں نہ ہو، ترقی معکوس ہوگی۔ بلکہ یہ حرکت جتنی تیز ہو، تنزل اتنا ہی تیز رفتار ہوگا۔

اسی طرح اندھی تقلید اور کورانہ نقالی صرف ماضی ہی کی نہیں ہوتی۔ حال کے مرقجہ

طریقوں اور ضابطوں کی بھی ہو سکتی ہے۔ اور کسی فرد یا قوم کی خودی اور اس کے صحت مندانہ ارتقاء کے لیے جتنی مہلک ماضی کے بتوں کی اندھی پرستش ہے اتنی ہی مہلک نئے بتوں کی پوجا بھی ہے۔ بلکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو نقالی دراصل جمود ہی کی ایک شکل ہے۔ اگرچہ ہے بڑی پُر فریب! عقل و فکر کو دونوں ہی صورتوں میں معطل کر دیا جاتا ہے۔ جمود میں آپ ماضی کی پرستش کرتے ہیں اور لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں تو نقالی میں آپ ماضی کے بجائے کسی نئے سورج کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کی اپنی خودی کے لیے دونوں تباہ کن ہیں۔

جو لوگ زمانے کے چلن کی پیروی کا بلاوا دیتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ دراصل دوسروں کی تقلید ہی کی دعوت دے رہے ہیں۔ اور تقلید اگر جدید کی کی جائے تو وہ کوئی فخر کے قابل چیز نہیں بن جاتی۔ اُس کے نقصانات علیٰ حالہٖ قائم رہتے ہیں جن کی بناء پر قوم کی اپنی تخلیقی صلاحیتیں کبھی اُبھرنے نہیں پاتیں۔ اس کی وجہ سے انسان کی روح میں جمود اور احساسِ کمتری پیوست ہو جاتا ہے۔ پوری قوم زمانے کو بدلنے کے بجائے بس خود اپنے ہی آپ کو بدلنے میں لگی رہتی ہے اور دوسروں کی شاگردی کے مقام سے آگے بڑھنا کبھی اسے نصیب نہیں ہوتا۔

پھر زمانے کی تبدیلی کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس امر کو بھی ملحوظ نہیں رکھتے کہ زمانہ تو بدلنے ہی کے لیے بنا ہے۔ آج وہ ایک خاص سمت میں تبدیل ہوتا ہے تو کل کسی دوسری سمت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے ہمیشہ اپنے ہی دور کی غالب تہذیب کو ترقی کا کمال سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن چشمِ تاریخ نے اس امر کا بارہا مشاہدہ کیا ہے کہ بڑی سے بڑی طاقتور تہذیب بھی ایک دن زوال کی نذر ہو جاتی ہے۔ یونانی تہذیب کے غلبہ کے زمانے میں یونانیت زدہ لوگ اسی کو تہذیبِ انسانی کا حرفِ آخر

سمجھتے تھے اور اس سے انحراف و اختلاف کو دیوانگی، پریشان خیالی اور کفر خیال کرتے تھے۔ لیکن ایک دن اس تہذیب کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور اب اس کی حیثیت آثارِ قدیمہ کی سی ہے۔ روم کے دورِ عروج میں یہی مقام رومی تہذیب کو حاصل ہوا لیکن بالآخر اس تہذیب کے بھی پرخچے اڑ گئے، اور آج اس کے آثار بالائے زمین نہیں بلکہ زیرِ زمین ڈھونڈے جا رہے ہیں! ایرانی تہذیب کی قسمت بھی اس سے مختلف نہ ہوئی اور یہی کچھ ان ۳۶ تہذیبوں کے ساتھ ہوا جو اپنے اپنے زمانہ میں غالب اور ناقابلِ تسخیر سمجھی جاتی تھیں۔ اگر ماضی کی تمام غالب تہذیبیں قابلِ تسخیر ثابت ہوئیں اور ایک دن کامیاب وہی لوگ ہوتے جو ان کی نقالی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی جگہ ایک دوسرا نظام پیش کرتے تھے تو مستقبل کے متعلق یہ کیوں تصور کر لیا جاتا ہے کہ جدید مغربی تہذیب کو — باوجود اس کے موجودہ غلبہ کے — مسخر نہیں کیا جا سکتا؟

محض یہ چیز کہ آج ایک خاص تہذیب کو غلبہ حاصل ہے اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یہی تہذیب مبنی برحق بھی ہے۔ نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اسی کو ہمیشہ قائم رہنا ہے اور نوعِ انسانی کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے آپ کو اسی کے مطابق ڈھال لے۔ طاقت اور غلبہ حق کے معیارات کو تبدیل نہیں کر دیتے اور اقتدار کسی چیز کو محاسن کا پیکر نہیں بنا دیتا۔ نہ ہر رائج شدہ چیز ناقابلِ تغیر اور ناقابلِ تسخیر ہوتی ہے۔ یہ کم نظروں کی سنت ہے کہ وہ طاقت کی پوجا کرتے ہیں اور ہر چڑھتے سورج کے آگے جھک جاتے ہیں۔ یہ کم نظروں کا طریقہ ہے کہ وہ محض اس بنا پر کسی مسلک کو اختیار کر لیتے ہیں کہ اسے اقتدار اور غلبہ حاصل ہے اور یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک غلط۔ حالانکہ دیکھنے کی اصل چیز غلبہ اور طاقت نہیں بلکہ کسی چیز کا حق یا باطل ہونا ہے۔ اگر زمانہ بدل رہا ہے تو اس کو مزید بھی بدلا جا سکتا ہے۔ لیکن محض زمین و آسمان کی گردش اور ماہ و سال کی آمد و رفت کی وجہ سے زندگی کے اصول، حق و باطل کے معیار، اور خیر و شر کے

تعینات نہیں بدلے جا سکتے۔

جدید ذہن کی تعمیر جن عوامل نے کی ہے ان میں وہ فکر و فلسفہ بھی شامل ہے جو ہر نئی چیز کو خوب تر اور قابلِ احترام اور لائقِ اختیار سمجھتا ہے۔ مغرب کے ذہن کو ہیومنزم (HUMANISM) کے فلسفے نے بہت متاثر کیا ہے اور اس فلسفہ کی اساس تاریخ میں ناگزیر ترقی کا اصول (INEVITABILITY OF PROGRESS) ہے۔ اس کی رو سے ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے بہتر ہے۔ انسان کا ورثہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ حال ماضی سے اچھا ہے اور مستقبل حال سے بہتر ہوگا۔ ہمارے قدم لازماً ترقی اور عروج کی طرف اٹھ رہے ہیں اور اب پیچھے ہٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ اس اصول کو ہیگل کے فلسفۂ تاریخ اور مارکس کی معاشی تعبیرِ تاریخ نے بڑی تقویت پہنچائی۔ یہ اسی انداز فکر کا نتیجہ ہے کہ ماضی کی ہر چیز کو کم مایہ اور حقیر اور حال کی ہر شے کو قابلِ قدر سمجھا جا رہا ہے اور ترقی کا لازمی تقاضا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ تغیرِ زمانہ کے نام پر ہر قدیم چیز کو بدل ڈالا جائے۔

یہ نظریہ بدیہی طور پر غلط ہے۔ ہمیں انسانی تاریخ میں ارتقاء کی کوئی سیدھی لکیر نظر نہیں آتی۔ یہ تاریخ بڑی کج رو واقع ہوئی ہے۔ اس میں ترقی بھی ہے اور تنزل بھی۔ عروج بھی ہے اور زوال بھی۔ ارتقاء بھی ہے اور انحطاط بھی۔ فراز بھی ہے اور نشیب بھی۔ ہر بعد کے دور کو پچھلے دور سے بہتر سمجھنا تاریخی لحاظ سے بالکل ایک غلط مفروضہ ہے جسے ہرگز صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ جدید فلاسفۂ تاریخ میں سے کوئی ایک بھی ہیگل اور مارکس کی اس توجیہ کو صحیح نہیں سمجھتا اور تاریخی حقائق اس کی توثیق کرنے سے انکاری ہیں۔ مسلسل ارتقاء کا نظریہ آج علمی حیثیت سے ایک متروک نظریہ ہے۔ لیکن اس کے بطن سے جس فاسد تصور نے جنم لیا ہے وہ عام پڑھے لکھے لوگوں کے دماغ پر مسلط ہے اور وہ اپنی ترقی پسندی کا ڈھول پیٹنے کے لیے محض فیشن کے طور پر ہر قدیم چیز پر ناک بھوں چڑھاتے اور ہر نئی چیز کی طرف بے سوچے سمجھے لپک

پڑتے ہیں۔ حالانکہ قدیم کو لازماً بُرا اور جدید کو لازماً اچھا سمجھنا اور تمام قدیم چیزوں کو تبدیلی کے خراد پر چڑھا دینا ایک غلط روش ہے جس کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں۔

پھر سوال یہ بھی ہے کہ زمانہ کے تغیّر کی نوعیت کیا ہے؟ اور یہ تغیر زندگی کے کس دائرے میں واقع ہو رہا ہے۔

کائنات کا وہ دَور جو زمین پر انسان کی آمد سے شروع ہُوا ہے اب تک جاری ہے۔ ارتقائے کائنات کے نقطۂ نظر سے اگر غور کیا جائے تو یہ امر صاف ظاہر ہے کہ یہ دَور اپنی چند متعین خصوصیات رکھتا ہے جو انسانی تہذیب کے سارے ہی مرحلوں میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان خصوصیات میں کوئی اساسی تبدیلی اسی وقت واقع ہو گی جب یہ دَور ختم ہو جائے گا اور کوئی دوسرا دَور شروع ہو گا (مثلاً دَورِ آخرت)۔ اس پورے زمانے میں انسان کی فطرت، کائنات کے فطری قوانین، انسانی زندگی کے اساسی اصول، حیات و موت کے ضابطے، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں، ہدایت و ضلالت کے قواعد، یہ تمام ایک ہی رہے ہیں اور ایک ہی رہیں گے۔ افراد پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں۔ تہذیبیں ابھرتی ہیں اور معدوم ہو جاتی ہیں۔ سلطنتیں بنتی ہیں اور بگڑتی ہیں۔ لیکن فطرت کے قوانین غیر متبدل ہیں۔ زندگی کی اصل غیر متغیر ہے، اور اجتماع و تمدن کے اساسی ضابطے ثابت و مستحکم ہیں۔ ایک ہی اصول ہیں جو کارفرما ہیں، ایک ہی حقیقت ہے جو جلوہ گر ہے۔ تغیر و تبدل صرف ظاہری اور سطحی چیزوں میں ہے، بنیادی اور اساسی چیزوں میں نہیں۔ اس لیے یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ زندگی کے موجودہ دَور میں جو تغیرات بھی واقع ہو رہے ہیں وہ ایک محدود دائرے میں ہیں، بنیادوں میں نہیں صرف فروع میں ہیں، اور ان کی بنا پر قدیم و جدید کا جھگڑا بجز کوتاہ نظری کے اور کچھ نہیں۔ بقول اقبال ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری، قصّۂ قدیم و جدید!

ہم تغیّر کے وجود کے منکر نہیں ہیں۔ یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں۔ لیکن جس چیز کا سمجھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس تغیّر کی نوعیت کیا ہے۔ اس لیے کہ اس کی نوعیت کو سمجھے بغیر کوئی صحت مند اجتماعی پالیسی اختیار نہیں کی جا سکتی۔

انسان کی اجتماعی زندگی میں جو تبدیلی بھی آ رہی ہے وہ ذرائع اور رسائل کی دنیا میں ہے۔ مقاصد اور اصول و اخلاق کی دنیا میں نہیں۔ فنی ایجادات اور ٹکنیکی انکشافات انسان کے وسائل اور فطری قوتوں پر اس کے اختیار کو برابر بڑھا رہے ہیں۔ زمان و مکان کی رکاوٹیں دُور ہو رہی ہیں اور انسان کا اقتدار بڑھ رہا ہے۔ لیکن یہ ساری تبدیلی ذرائع و وسائل ہی کی حد تک ہو رہی ہے۔ اس تبدیلی کا یہ تقاضا ہرگز نہیں کہ مقاصدِ زندگی، اصول اخلاق اور اقدارِ حیات کو بھی تبدیل کر دیا جائے۔ اگر ہوائی جہاز، جیٹ اور راکٹ کے استعمال سے زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں تو اس کے یہ معنی کب ہیں کہ زنا جو کل تک حرام تھی آج حلال ہو جائے؟ اگر برقی قوت کے ذریعہ انسان کے پاس وہ طاقتیں آ گئی ہیں جو پہلے صرف جنوں اور فرشتوں کو حاصل تھیں تو اس کا آخر کیا اثر خیر و شر کے اصولوں کی صداقت پر پڑتا ہے؟ میزائل اور اسپوٹنک کے استعمال کا آخر یہ تقاضا کب ہے کہ جھوٹ، سُود، سٹہ، شراب اور دوسرے منکرات کو جائز قرار دے دیا جائے؟ صنعتی ترقی کا آخر یہ تقاضا کب ہے کہ اصولِ انصاف کو بھی بدل دیا جائے؟

جو حضرات سطحی نظر رکھتے ہیں وہی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ یہ تغیرات اصولوں میں ردّ و بدل کے مقتضی ہیں۔ درحقیقت تمام ایجادات و انکشافات انسان کے لیے ہیں انسان ان کے لیے نہیں۔ تمام مادی ترقیات اسی وقت مفید ہو سکتی ہیں جب وہ انسان کی بھلائی کے لیے استعمال ہوں، خود بھلائی اور برائی کے اصول ان کی خاطر نہ بدل جائیں۔ یہ قوتیں جو انسان کو حاصل ہوئی ہیں اُسی وقت نافع ہیں جب وہ اعلیٰ مقاصدِ حیات کی تابع ہوں، اپنے لیے میں انہیں بہا کر نہ لے جائیں۔ مقاصد و اصول کو ان کے مطابق نہیں بلکہ ان کو مقاصد و اصول

کے مطابق بدلنا چاہیے۔ مقاصد اور اصولوں کی حیثیت تو اُن معیارات کی ہے جن سے تکنیکی ترقیات کے حسن و قبح کو ناپا جائے گا۔ اگر ان ترقیات کے باوجود انسان ہی پریشان و مضطرب رہتا ہے تو پھر ساری مادی ترقی بے کار ہے ؎

نہ کلی ہے وجہِ نظر کشی، نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی، سببِ نشاطِ بہار ہے

انسانی زندگی میں تغیر کا منہاج کچھ ایسا ہے کہ تبدیلی کے ساتھ ساتھ ثبات اور دوام کا بھی ایک پہلو موجود ہے۔ تبدیلی ہر لحظہ آتی ہے لیکن بنیادی حقیقت کو متاثر کیے بغیر اپنا ظہور کرتی رہتی ہے۔ مثلاً انسان کے جسم اور اس کی ذات کو لیجیے۔ سائنس کے مشاہدات ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان کے نظامِ جسمانی میں ہر لمحہ تغیرات ہو رہے ہیں۔ ایک بچے کے جسم کا ایک ایک ریشہ جوان ہونے تک بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ حتیٰ کہ ایک خاص مدت میں ہر مرتبہ انسان کا جسم اپنے کو بالکل تبدیل کر کے ایک نیا جسم بن جاتا ہے لیکن اس تبدیلی میں بنیادی نظام وہی رہتا ہے اور ہر شخص کی اساسی شخصیت اس کی "انا" غیر متبدل رہتی ہے۔ اسی کیفیت کو نکولائی بردائیف (NICOLI BERDYVE) ان الفاظ سے تعبیر کرتا ہے کہ "انسانی ذات، تغیرات کے جلو میں عدمِ تغیر کا نام ہے" (PERSONALITY IS CHANGEL ESSNESS IN CHANGE)۔ اور برگسان نے اس بات کو یوں ادا کیا ہے کہ "ہم میں تغیر تو آتا ہے لیکن ہماری بنیادی حقیقت معدوم نہیں ہوتی"۔

اسی طرح درختوں کو دیکھیے۔ ایک درخت ایک خاص مدت میں اپنے پھول پتے بالکل تبدیل کر لیتا ہے۔ اس کی زندگی میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں لیکن یہ تبدیلی اس کی اصل کو نہیں بدلتی بلکہ اس سے ہم آہنگ رہتی ہے۔ ایک بنیادی رنگ ہے جو بہر صورت غالب رہتا ہے اور یہی اس کی انفرادیت ہے ؎

صبحِ بہار آئی ہے لیکر رُت بھی نئی، شاخیں بھی نئی
غنچہ و گل کے رُخ پر لیکن رنگ قدامت آج بھی ہے

یہ فطرت کا قانون ہے جو ہر شعبۂ زندگی میں جاری و ساری ہے۔ انسان کی اجتماعی اور تہذیبی زندگی میں بھی ہمیں یہی جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اسی بنیاد پر علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

"ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ زندگی محض تغیر ہی نہیں، اس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے ... لہٰذا اس ہر لحظہ آگے ہی آگے بڑھنے والی حرکت میں انسان اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کر سکتا ... اسی بات کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں ادا کریں گے کہ زندگی چونکہ ماضی کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھتی ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ جماعت میں تغیر و تبدل کا جو نقشہ بھی ہم نے قائم کیا ہو اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف کو فراموش نہ کریں۔" (خطبات صفحہ ۲۵۷۔ ترجمہ نذیر نیازی)

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ:

—— ہر تبدیلی موجبِ خیر ہی نہیں ہوتی ہے۔ جو چیز مطلوب ہے وہ محض تبدیلی نہیں بلکہ صحیح سمت میں تبدیلی ہے۔

—— محض زمانہ کے چلن کا اتباع کسی فرد یا قوم کے لیے فلاح کا باعث نہیں ہو سکتا۔

—— کسی چیز کے غالب ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ لازماً اچھی اور صحیح بھی ہے۔ یا یہ کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہے۔

—— ناگزیر ترقی کا اصول ایک فاسد اصول ہے جس کی تائید تاریخ سے نہیں ہوتی۔

—— زمانہ کے تغیر کی نوعیت بڑی غور طلب ہے۔ تبدیلی کا دائرہ بڑا محدود ہے۔ تبدیلی بنیادوں میں نہیں، صرف فروع اور ظواہر میں ہوتی ہے۔ انسانی فطرت، کائنات

کے بنیادی قوانین اور ہدایت و ضلالت کے ضابطہ میں کسی تغیر کا سوال نہیں۔
—— زندگی صرف تغیر کا نام نہیں بلکہ وہ تغیر اور ثبات دونوں کے توازن سے قائم ہے اور صحت مند نظام وہی ہو سکتا ہے جو دونوں پہلوؤں میں کامل توازن قائم کرے۔
ان امور کے متحقق ہو جانے کے بعد اب مسئلہ کی مزید تنقیح ہمارے لیے بہت آسان ہو جاتی ہے۔

اسلام خدا کی اس ہدایت کا نام ہے جو اس نے اپنے برگزیدہ نبیوں کے ذریعے انسان کی رہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً بھیجی ہے اور جو اپنی آخری اور مکمل شکل میں ہم کو محمد رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے ذریعہ سے پہنچی ہے۔ یہ وہ ضابطۂ حیات ہے جو عین فطرت کے اصولوں پر قائم ہے اور انسان اسی کے ذریعہ سے دنیاوی اور اخروی دونوں کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے۔ یہ زندگی کا مکمل قانون ہے۔ اس قانون کو انسان نے نہیں خدا نے بنایا ہے۔ یہ ابد الآباد تک کے لیے ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔

لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ۔ (یونس ۶۴) — خدا کی باتیں (یعنی اس کے احکام و فرامین) بدلے نہیں جا سکتے۔

وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (الانعام ۳۴) — اور خدا کی باتوں کو بدل دینے والا کوئی نہیں

لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الروم ۳۰) — خدا کی بنائی ہوئی ساخت میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (الاحزاب ۶۲) — اور تم خدا کے طریقے میں تبدیلی نہ پاؤ گے

قرآن پاک کی یہ آیات بالکل صاف اور واضح ہیں اور اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ خدا کا دین، اس کے احکام اور قوانین ہمیشہ کے لیے ہیں اور محض زمانے

کی تبدیلی کی وجہ سے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تبدیلی زمانے میں کرنی ہو گی، خدا کے قانون میں نہیں۔ مردود وہ ہیں جو ع

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں بدعت شروع کرنے والے اور بدعتی کی تعریف کرنے والے پر خدا کی لعنت ہو۔

اگر اس مسئلہ پر عقل سلیم کی روشنی میں غور کیا جائے تو فکر و نظر کا ہر گوشہ اس بات پر گواہی دیتا ہے کہ خدا کے قانون میں کسی تبدیلی کی نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ اور اس کی وجہ بھی بہت واضح ہے۔ زمانے کی تبدیلی کا اثر اُس قانون اور اصول پر پڑتا ہے جسے انسان نے بنایا ہو۔ انسانی فکر زمان و مکان کی حدود میں مقید ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے تمام حقائق سے واقف نہیں۔ وہ ایک محدود بصیرت کے ساتھ آج ایک چیز کو صحیح سمجھ کر پیش کرتی ہے مگر کل جب وہ حالات سامنے آتے ہیں جن کا کوئی تصور پہلے موجود نہ تھا، تو وہ غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا علم ہر شے پر محیط ہے۔ زمان و مکان کی قیود اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ جو قانون ایسے خدا کی طرف سے ہو اس کا کسی ایک مخصوص زمانے کے ساتھ محدود ہو جانا کیسے ممکن ہے۔ خدا کے علم اور خدا کے دیئے ہوئے قانون کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کبھی از کار رفتہ ہو جائے۔ وہ تو ہمیشہ اتنا ہی تازہ رہے گا جتنی صبح نو!

ثانیاً، خدا کا یہ قانون بنیادی طور پر ہدایت و ضلالت کی حقیقت کو واضح کرتا ہے اور اُن اصولوں اور اُن اقدار کو بیان کرتا ہے جن پر وقت کے تغیرات، تہذیبوں کے عروج و زوال اور ماہ و سال کی آمد و رفت کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ فطرت کے اصولوں کو بیان کرتا ہے اور فطرت کا قانون قائم و مستحکم ہے۔

ثالثًا، قرآن و سنت اصولی رہنمائی دیتے ہیں، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں اور ان اساسی اداروں کو قائم کرتے ہیں جنہیں ہر زمانے میں قائم رہنا چاہیے۔ ان چیزوں پر زمان و مکان کے تغیّر کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں اور ان میں تبدیلی فطرت کے قانون کے خلاف ہوگی۔

ان وجوہ کی بنا پر زمانے کی تبدیلی کے مطابق اسلام کے تبدیل کیے جانے کا قطعًا کوئی امکان نہیں۔

یہی چیز ہے جو انبیاء و صلحاء کی سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے۔ ہر نبی ایسے حالات میں مبعوث ہوا جب زمانہ کا بگاڑ اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا اور زندگی کا دریا بالکل غلط رُخ پر رواں دواں تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بھی نبی نے زمانے کے چلن کے مطابق اسلام کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ زمانہ کے رنگ سے متاثر نہ ہوئے بلکہ زمانے کو اپنے رنگ میں رنگنے کی سعی میں مصروف ہوگئے اور بالآخر اس پر صبغۃ اللہ کو غالب کر دیا۔ قرآن میں اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ (الصف۔۹)	وہ خدا ہی ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے، خواہ مشرکوں کو کیسا ہی ناگوار ہو۔

ہدایت اور دینِ حق ہیں ہی اس لیے کہ انبیاء ان کو دنیا کے باقی تمام نظاموں اور طریقوں پر غالب کریں۔ خدا کا دین اس لیے نہیں ہے کہ اسے زمانہ کے چلن کے مطابق بدلا جائے بلکہ اس لیے ہے کہ زمانے کو اس کے مطابق بدلا جائے اور اس کو غلبہ و اختیار کا مقام حاصل ہو۔ مشرکوں، کافروں اور منافقوں کی تو دلی تمنا ہی یہ ہوتی

ہے کہ دین کو ان کے منشاء کے مطابق بدلا جائے لیکن خدا اس بات کو صاف کر دیتا ہے کہ ان کی ناخوشی کا ہرگز کوئی خیال نہیں کیا جا سکتا۔ سربلندی دین کو حاصل ہونی چاہیے اور زمانہ پر اس کی حکمرانی قائم ہونی چاہیے۔

انبیاء کی سیرت اسی حقیقت پر شاہد ہے۔ حضرت نوحؑ کی قوم بغاوت پر تلی رہی۔ آپ نے ساڑھے نو سو سال تک دین حق کی دعوت دی لیکن ایک دن کے لیے بھی وہ "وقت کے تقاضوں" کے مطابق دین کو تبدیل کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ ان کی دعوت یہی رہی کہ

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ — اے میری قوم! خدا کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانے کی تہذیب کے کئی بڑے مراکز پر دعوتِ حق دی لیکن کہیں بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق دین کو نہیں ڈھالا۔ انہوں نے آگ اور جلاوطنی کے مصائب کو انگیز کیا لیکن دین پر حرف نہ آنے دیا۔ حضرت لوطؑ کی قوم شدید قسم کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھی مگر آپ نے زمانے کے چلن کو دیکھ کر دین میں ترمیم نہیں کی بلکہ زمانے کے خلاف بغاوت کی۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کے طور طریقوں کو اختیار کرنے کی بجائے اسے خدا کے غیر متبدل قانون کی پیروی کے لیے پکارا۔ حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی سرکشی کے لیے کوئی الاؤنس نہ دیا اور انہیں خوش کرنے کے لیے دین میں کسی کمی بیشی کو گوارا نہ کیا۔ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کی معاشی "ترقی" کی خاطر ان کے ظالمانہ معاشی نظام کو قبول کر کے دین میں ترمیمات نہ کیں بلکہ ان کو کامل اطاعت کی دعوت دی۔ تمام انبیاء کی سنت یہی رہی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مشرق سے مغرب تک جو نظام چل رہا تھا اسے قبول کرنے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو اور اپنے دین کو ڈھالنے کے بجائے آپ نے اسے ایک فاسد نظام قرار دیا، ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ

(خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا ہے) لیکن خدا کے نبی نے زمانے کے تقاضوں سے COMPROMISE اور اس کے ساتھ مصالحت کرنے کے بجائے اس کی ہر ہر خرابی کے خلاف جنگ لڑی۔ زمانے کے آگے جھکنے کا مشورہ دینے والوں کو آپ کا صاف جواب یہ تھا کہ:

واللہ! لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علیٰ ان اترک ھٰذا الامر ما ترکتہ حتیٰ یظھرہ اللہ او اھلک فیہ۔

خدا کی قسم! اگر یہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ کر کہیں کہ مہر و ماہ کے عوض میں اس دعوت کو ترک کر دوں تو میں ہرگز اسے ترک نہ کروں گا یہاں تک کہ یا تو اللہ اس دعوت کو کامیاب فرما دے یا میں اس راہ میں جان دے دوں۔

انبیاء کا طریقہ یہ نہیں رہا کہ وہ زمانے کے آگے جھکیں اور لوگوں کو راضی کرنے کے لیے خدا کے دین کو بدلیں۔ وہ حق کے پیغامبر ہوتے ہیں اور زمانے کی رو کے خلاف اپنی دعوت پیش کر کے اسے تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ اگر وہی زمانے سے مطابقت اختیار کر لیں تو پھر انسانیت کی فلاح و اصلاح کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

اِس اسوۂ انبیاء کے اتباع کی بہترین مثال ہمیں حضرت ابوبکرؓ کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ حضور اکرمؐ کی وفات کے بعد یکایک عرب کا نقشہ پلٹ گیا۔ ہر طرف سے بغاوتوں نے سر اٹھایا۔ نئے نئے نبی اٹھ کھڑے ہوتے۔ بہت سے قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ صحابہ کبار تک اس صورتِ حال پر پریشان ہو گئے اور لوگ یہ رائے پیش کرنے لگے کہ مصلحت وقت کی خاطر قبائل کے ساتھ نرمی برتی جائے اور وقت کے تقاضوں کا لحاظ کیا جائے۔ مگر صدیقِ اکبر کا جواب یہ تھا کہ

"واللہ! مجھ پر یہ فرض ہے کہ جو کام میں رسول اللہ کو کرتے دیکھ چکا ہوں خود

بھی وہی کروں اور اس سے سرِ مُو انحراف نہ کروں۔ اگر جنگل کے کتے اور بھیڑیئے مدینہ میں داخل ہو کر مجھے اٹھا لے جائیں تو بھی میں وہ کام کرنے سے باز نہ آؤں گا جسے رسول اللہ نے کرنے کا حکم دیا ہے۔"

"واللہ! اگر مانعینِ زکوٰۃ اونٹ باندھنے کی ایک رسّی دینے سے بھی انکار کریں گے جسے وہ رسول اللہ کے زمانے میں ادا کرتے تھے، تو بھی میں ان سے جنگ کروں گا۔ خدا کی قسم! میں زکوٰۃ اور صلوٰۃ میں فرق کرنے والے لوگوں سے ضرور لڑوں گا۔"

اسلام عبارت ہی نبی کی سنّت کی پیروی سے ہے۔ اگر زمانے کی سنّت نبی کی سنّت سے متعارض ہے تو وہ شخص اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹا ہے جو نبی کی سنّت کو چھوڑ کر زمانے کی سنت کا اتباع کرے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کا دین ثابت و محکم ہے اور محض زمانے کے انداز دیکھ کر اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ خیال کرنا بھی غلط ہوگا کہ زمانے کے تغیّرات کو دین اسلام کلی طور پر نظر انداز کرتا ہے۔ اسلام کا طریقِ کار یہ ہے کہ وہ ہدایت ضلالت کے بنیادی اصول بتا دیتا ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے وہ حدود واضح کر دیتا ہے جو انسان کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے درکار ہیں۔ رہے جزوی اور وقتی امور تو ان کو شریعت کے دیئے ہوئے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر ہر وقت اور ہر زمانے میں طے کرنے کی اجازت ہے۔ یہ کام اجتہاد کے ذریعہ انجام پاتا ہے اور اسی کے ذریعہ نظامِ دین میں حرکت و ارتقاء کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ زمانے کے تغیّرات پر دو قسم کے ردِّ عمل (RESPONSE) اسلامی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ ایک کا نام "تجدید" ہے اور دوسرے کا "تجدّد"۔

تجدید یہ ہے کہ زمانے کے تغیرات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصل دین کو بلا کم و کاست پیش کیا جائے اور اپنے دور اور اپنے زمانے کی زبان میں محکم استدلال کے ساتھ پیش کیا جائے۔ نیز تدبر و اجتہاد کے ذریعہ دین کو اپنے دور کے حالات پر نافذ کرنے کی عملی جدوجہد کی جائے۔ اُن تمام ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے جو قدرت نے انسان کو فراہم کیے ہیں۔ اور اسلامی بصیرت کے ساتھ نئے پیش آمدہ مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں طے کیا جائے۔ تجدید کے ذریعہ ہر زمانے میں دین کی تعلیمات اور زندگی کے بہاؤ کے درمیان تعلق اور رابطہ گہرا ہوتا جاتا ہے اور زندگی کا دریا اسلام کی شاہراہ سے ہٹ کر چلنے نہیں پاتا۔ یہاں مخلصانہ اجتہاد کے ذریعہ نئے مسائل اور نئی مشکلات کو حل کیا جاتا ہے اور دین اپنے رنگ پر قائم رہتا ہے۔

تجدد اس کے مقابلہ میں وہ کوشش ہے جو زمانے کے تقاضوں کے نام پر خود دین کو بدل ڈالنے کے لیے کی جاتی ہے۔ زندگی اور زمانے کے درمیان ربط اس طریقے سے بھی قائم ہو جاتا ہے لیکن یہ ربط اسلام کی سرزمین پر نہیں غیر اسلام کی سرزمین پر قائم ہوتا ہے۔ اس میں اسلام کو اصل قرار دے کر حالات کو اس کے مطابق ڈھالنے کے بجائے زمانے کی چلتی ہوئی تہذیب کو اصل مان کر اُس کے پیدا کیے ہوئے حالات پر اسلام کو ڈھال دیا جاتا ہے۔ اس طریق کار کو اگر مسلمان ہر زمانے میں اختیار کرتے چلے جائیں تو اسلام کی کوئی چیز بھی اپنی جگہ پر باقی نہیں رہ سکتی، بلکہ اسلام سرے سے کسی متعین مذہب و مسلک اور نظریہ و نظام کا نام ہی نہیں رہتا۔

اسلام میں تجدید کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے ہیں اور پوری تاریخ میں اسلام کے سچے خادم یہ کارنامہ انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لیکن تجدد کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ ماضی میں جب بھی تجدد نے سر اٹھایا ہے مسلمانوں نے سختی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا ہے اور ہر ایسی تحریک کوشش ملت کی رائے عام سے ٹکرا کر آخر کار ختم ہو گئی ہے۔

آج بھی بنیادی کشمکش تجدید اور تجدد ہی کے درمیان ہے۔ اور ہماری پوری تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ دین کو متجددین کی خاطر نہ کبھی ماضی میں بدلا گیا ہے اور نہ آج بدلا جا سکتا ہے۔ کسی مصطفےٰ کمال، کسی جمال ناصر، کسی جنرل گرسل یا کسی اور حکمران یا صاحبِ اثر شخصیت کی یہ طاقت نہیں ہے کہ زمانے کے تقاضوں کا نام لے کر اسلام کو بدل سکے۔ اس معاملے میں جو انجام "اکبر اعظم" کی کوششوں کا ہو چکا ہے وہی انجام ان نئے متجددین کے لیے بھی مقدر ہے۔ دین میں مسخ و تحریف کی کوئی تدبیر اگر طاقت کے بل پر زبردستی نافذ کر بھی دی جائے تو اسے مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے نہ ماضی میں کبھی قبول کیا ہے اور نہ آج قبول کر سکتا ہے۔ اس دین کی حفاظت کی ذمہ داری خدا نے لی ہے اور اس نے ایسے ذرائع بھی پیدا کر دیئے ہیں کہ اس کی حفاظت ہوتی رہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔

آخر میں ایک بات کی طرف ہم اور اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ پوری انسانی تاریخ اس امر پر گواہ ہے کہ ہمیشہ عظیم کارنامے انہی لوگوں نے انجام دیئے ہیں جو حالات کی رو پر بہنے کے بجائے ان کا مقابلہ کرنے اٹھے ہیں۔ زندگی پر امٹ نقوش انہوں نے نہیں چھوڑے جو مرغ بادِ نما کی طرح ہوا کے رُخ پر مڑتے اور دوسروں کی نقالی کرتے رہے بلکہ ان لوگوں نے چھوڑے ہیں جو ہوا کے رُخ سے لڑے ہیں اور زندگی کے دھارے کو موڑ کر رکھ دیا ہے۔ بڑے کام لکھی پر لکھی مارنے والوں نے نہیں کیے، اپنی راہ آپ نکالنے والوں نے کیے ہیں۔ بہادر وہ نہیں ہے جو دوسرے کے مارے ہوئے شکار کو کھاتا ہے، بہادر وہ ہے جو اپنا شکار خود کرتا ہے۔ قابلِ تقلید وہ نہیں ہے جو گرگٹ کی طرح صبح و شام رنگ بدلتا ہے بلکہ وہ ہے جو خود اپنا کوئی رنگ رکھتا ہے اور دنیا کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ مسلمان دنیا میں زمانے کے پیچھے

چلنے کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں۔ وہ تو پوری انسانیت کی طرف اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ جسے خدا نیکی کہتا ہے اس کا حکم دیں، جسے خدا بدی کہتا ہے اسے مٹائیں اور دنیا میں خدا کی اطاعت کی روش کو عام کر دیں۔ وہ دوسروں کے رنگ میں رنگے جانے کے لیے نہیں ہیں، دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے ہیں:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کیے
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	گئے ہو تاکہ نیکی کا حکم دو، برائی سے روکو اور
وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۔ (آل عمران -- ۱۱۰)	اللہ پر ایمان لاؤ۔

یہ ہے مسلمانوں کا اصل مقام ـــ مگر انہیں ڈالا کس راہ پر جا رہا ہے؟ بقولِ اقبال ؎

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

درحقیقت مسلمان کے لیے اس سے بڑی ذلت کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ خدا کے پیغام کا امین ہونے کے باوجود زمانے کو اپنے دین کے مطابق بدلنے کے بجائے خود زمانے کی رو پر بہنے لگے اور اس کے ساتھ اپنے دین کو بھی مسخ کرنے کی کوشش کرے۔ یہ بزدلوں اور کم نظر لوگوں کا طریقہ ہے۔ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جنہیں ہوائیں خس و خاشاک کی طرح اڑاتے لیے پھرتی ہیں، جن کی اپنی کوئی جڑ نہیں ہے کہ وہ اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو سکیں۔ یہ مسلمان کا شیوہ نہیں۔ مسلمان کا شیوہ تو یہ ہے کہ

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

ضروری اعلان

خریداران حضرات خط و کتابت کرتے وقت یا منی آرڈر کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیں۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف ہے۔ مینجر